فلسطینی ریاست، امکانات اور مسائل

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

بیسویں اور اکیسویں صدی میں برپا ہونے والی شدت پسند تحریکات کو عموماً مشرق وسطیٰ میں فلسطینی عوام پر کیے جانے والے مظالم اور استحصال کا ردعمل قرار دیا جاتا رہا ہے عراق اور افغانستان میں امریکی جارحیت کے بعد گفتگو کا مرکز طالبان کی طرف منتقل ہو گیا اور آج دنیا میں دہشت گردی کے تصور کو طالبان اور اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے اسلام میں پائی جانے والی جہاد کی تعلیم سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اسی کی ایک شکل دینی مدارس پر گرنے والے نزلہ کی ہے۔ دہشت گردی دنیا میں کہیں بھی ہوا سے کھینچ تان کر طالبان اور دینی مدارس سے تربیت پانے والے طلبہ پر لا کر چھوڑا جاتا ہے۔ اس تناظر میں عالمی امن کا قیام ایک خواب بن کر رہ گیا ہے اور مغربی سیاست کار مسلسل اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ عالمی امن کا قیام صرف اسی وقت ممکن ہے جب مسلمان نوجوانوں کو ''مذہب'' سے آزادی اور لادینی تعلیم کے ذریعہ ان کی فکر کو مغربی تہذیب وثقافت سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔

مغربی مفکرین اور سیاست کاروں کی اس طویل المیعاد حکمت عملی کو خود مسلم ممالک میں پائے جانے والے دانش وَر تعلیمی اور ابلاغی میدانوں میں رائج کرنے میں مصروف ہیں۔ اس درآمد شدہ حل پر تنقیدی اور معروضی نظر ڈالنے کی ضرورت روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔

فلسطین کے حوالے سے مسلم دنیا کی لاتعلقی ایک عظیم المیہ ہے۔ OIC ہو یا عرب لیگ دونوں تنظیموں نے آج تک زبانی جمع خرچ سے آگے کوئی نتیجہ خیز قدم نہیں اٹھایا۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین

(PLO) کا کردار بھی عرصہ سے متنازع سمجھا جاتا رہا ہے۔ البتہ حماس کے قیام کے بعد سے فلسطین کی آزادی کا مسئلہ عالمی سطح پر دوبارہ توجہ کا مستحق بنا اور آخر کار مغربی ممالک فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ حماس کو بھی اہمیت دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

مسئلہ کا بنیادی حل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ فلسطینی عوام کو ان کے آبائی وطن میں ان کی رائے کے مطابق اپنی ریاست قائم کرنے کا بنیادی حق دیا جائے۔ لیکن اقوام متحدہ ہو یا یورپی یونین یا اور کوئی مغربی ادارہ ان سب تنظیموں اور حکومتوں کو اسرائیلی حکومت کی جارحانہ حکمت عملی نے اتنا متاثر کیا ہوا ہے کہ مجبوراً اس بات کا اعتراف کرنے کے باوجود کہ غزہ میں اور فلسطینی اتھارٹی کے زیر تسلط علاقے میں فلسطینیوں کے ساتھ جو ظالمانہ رویہ اسرائیل نے اختیار کیا ہے وہ غلط ہے، ان اداروں میں ابھی تک اپنے ضمیر کی آواز کو سننے اور اس پر عمل کرنے میں تردد نظر آ رہا ہے۔

اکتوبر ۲۰۱۴ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ایک قرارداد پیش کی گئی کہ سفارتی طور پر فلسطینی ریاست کے قیام کو تسلیم کیا جائے۔ اس موقع پر قدامت پسند پارٹی کے رکن رچرڈ اوٹاوے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ وہ ۲۰ سال سے ہر ایک معاملہ میں اسرائیل کی حمایت کرتے رہے ہیں لیکن اب اسرائیلی مظالم اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ ان جیسا اسرائیل دوست اور غم گسار بھی یہ سمجھتا ہے کہ اسرائیل اپنے دوستوں کو کھو رہا ہے اس لیے وہ اس قرارداد کی مخالفت نہیں کریں گے۔ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ یہ اقرار کرنے کے باوجود کہ اسرائیل حق پر نہیں ہے، ظلم کر رہا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، رچرڈ نے کھل کر یہ نہیں کہا کہ میں اس قرارداد کی حمایت کرتا ہوں۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی لابی کتنی کامیابی کے ساتھ دنیا کے نام نہاد جمہوری ممالک کی پارلیمنٹ اور حکومت تک پہنچ رکھتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسلم دنیا کے رہنما اپنی ذات سے آگے کسی مسئلہ پر سوچنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

فلسطین کی آزادی کے لیے ساٹھ سال سے اوپر کی جدوجہد کے بعد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ

اب حماس بھی دو ریاستوں کے ممکنہ حل کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن اس پیش رفت میں بھی اسرائیل ہر قدم پر روڑے اٹکانے اور ایک جانب اندرونی طور پر فلسطینی دھڑوں کو آپس میں بدظن اور مخالفت پر آمادہ کرنے اور دوسری جانب مگرمچھ کے آنسوؤں کے ساتھ مغربی ممالک کے سامنے واویلا کرنے میں مصروف ہے کہ فلسطینیوں کو کسی قیمت پر آزادی نہ ملے۔

مغربی ذرائع ابلاغ کی روشنی میں اسرائیل کی نسل کش اور نسل پرست پالیسی کا اظہار ان جائزوں سے ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً مغربی محققین کے مقالات میں جگہ پاگئے ہیں۔ کاؤنٹر پنچ (Counter Punch) کے ۲۸ اکتوبر، ۲۰۱۴ء کے شمارے میں Ben Nortin کے قلم سے نکلے ہوئے ایک مضمون میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اسرائیلی آبادی اس بات پر راضی نہیں ہے کہ کوئی فلسطینی جو اسرائیل کی حدود میں رہتا ہو اسرائیلی بسوں میں یہودیوں کے ساتھ سفر کرے۔ یہ وہی ذہن ہے جو جنوبی افریقہ میں برطانوی نژاد سفید فام اقلیت نے جنوبی افریقہ کی اکثریت کے ساتھ اختیار کیا تھا یا ۱۹۶۰ء تک امریکہ میں جنوبی خطوں میں امریکی سیاہ فام آبادی کے ساتھ اختیار کیا جاتا تھا۔

وہ اقوام جو حقوق انسانی کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں اس صورت حال پر گم سُم ہیں اور کوئی سربراہ مملکت یا پارلیمنٹ اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتی کہ اس نسلی نفرت کی پالیسی پر ایک حرف تنقید بلند کرے۔

اس مضمون میں یہ کہا گیا ہے کہ ۴۹٪ یہودی یہ رائے رکھتے ہیں کہ ''عربوں'' کو یکساں حقوق نہیں ملنے چاہییں، ۴۲٪ یہودی یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایک عمارت میں یہودی اور عرب ایک ساتھ رہائش نہ رکھیں۔ ۶۹٪ یہ چاہتے ہیں کہ ۲٫۵ ملین فلسطینیوں کو ووٹ کا کوئی حق نہ دیا جائے اور مغربی کنارے کو زبردستی اسرائیل میں شامل کرلیا جائے۔ ۴۷٪ اسرائیلی یہ رائے رکھتے ہیں کہ عربوں اور اسرائیلیوں کے لیے سڑکیں بھی الگ الگ ہوں۔

ایک جانب اسرائیلی نفرت کا یہ حال ہے کہ وہ ''عربوں'' کے وجود کو برداشت کرنے پر تیار نہیں

ہے جو تاریخی طور پر فلسطین کے اصل باشندے تھے اور جنہیں ایک منصوبہ کے تحت دنیا کے مختلف خطوں سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں آباد کرنے کے نتیجے میں ایک اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ وہی حکمت عملی ہے جو ہندوستان نے مقبوضہ کشمیر میں اختیار کی ہے کہ ہندوستان سے ہندوؤں کو لا کر آباد کیا جائے تا کہ تھوڑے عرصہ میں آبادیاتی (Demographic) تبدیلی کے نتیجے میں یہ کہا جائے کہ کشمیری مسلمان اقلیت ہیں اور کشمیر کے اصل باشندے وہ ہندو ہیں جنہیں ہندوستان سے لا کر مقبوضہ کشمیر میں بسایا گیا ہے۔

نہتے فلسطینیوں پر مظالم کا حال یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت جب چاہے سیکڑوں افراد کو جیلوں میں نظر بند کر دیتی ہے۔ صرف ۲۰۱۴ء کے موسم گرما میں ڈیڑھ ہزار فلسطینی مسلمانوں کو، بشمول ۴۰ بچوں کے، جیل میں بند کر دیا گیا اور انہیں اس قید کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔

جون ۲۰۱۴ء میں حماس نے اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کی اور فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ مکالمے اور افہام وتفہیم کے عمل کا آغاز کیا۔ اس مکالمے کے نتیجے میں یہ امکان روشن ہوا کہ یہ دونوں دھڑے ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور حماس فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ مل کر کوئی سیاسی حل نکالے۔ یہ حل بظاہر ایک فلسطینی ریاست کے قیام اور نتیجتاً اسرائیل کو تسلیم کرنے کا نظر آرہا ہے۔ یورپی یونین کے دو کمیشن اس حل کو قابل عمل بنانے میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری جانب مسلم دنیا میں سے صرف ایران اور قطر اس معاملہ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ مصر میں صدر مرسی کی حکومت کو بزور فارغ کرنے کے نتیجے میں فلسطینیوں کو مصری حمایت بھی حاصل نہیں۔ حزب اللہ (بیروت) کی لبنان میں پالیسی کو پسند کرتے ہوئے حماس اب اس طرف آگے بڑھ رہی ہے کہ فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ تعلقات قائم کر کے وہ بھی عسکری قوت کی جگہ سیاسی گفت وشنید کے ذریعہ جزوی طور پر اپنے مطالبات کو منوانے کی کوشش کرے۔

مسلم دنیا کی لاتعلقی ایک ناقابل معافی جرم ہے ترکی نے غزہ میں مظلوموں کی امداد کے لیے

جرأت مندانہ اقدام کیا اور اگر دیکھا جائے تو عرب دنیا کے مقابلہ میں ترکی آج بھی فلسطینی مسلمانوں کی پشت پناہی میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن جب تک مسلم دنیا باہمی اتفاق کے ذریعہ ایک واضح، جرأت مندانہ اور قابل عمل حکمت عملی پر عمل نہیں کرتی مسئلہ کے جزوی حل ''عالمی امن'' کو قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

تحریکات اسلامی کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ ایک جانب مظلوم کی حمایت اور دوسری جانب جن ممالک میں یہ تحریکیں کام کر رہی ہیں وہاں کی لادینی حکمران جماعتوں کو فلسطینی مسلمانوں کی حمایت پر آمادہ کرنا یہ دونوں کام مسلسل کرنے کے ہیں اور مسلم امہ کو اس مسئلہ میں آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

فلسطینی مسلمانوں کا اپنی رائے کو استعمال کر کے اپنے لیے ایک آزاد حکومت قائم کرنے کا مشن محض مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ عالمی ضمیر کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے کہ انسانوں کو اس ظلم سے نجات دلائی جائے جو اسرائیل ان پر دن رات توڑ رہا ہے۔